دین اور سیاست

علامہ اقبال کے بعض اشعار کی حیثیت قاعدہ کلیہ یا نظری مسلمات کی سی معلوم ہوتی ہے جس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ مشہور مصرع ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' بھی اسی درجہ کا حامل ہے۔ اس مصرع کے مطابق گویا تہمتِ چنگیزیت سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ سیاست کو دین سے جدا نہ کیا جائے' جو اسی طور ممکن ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں لازم ہو کہ امورِ سیاست و حکومت پر دینی تعلیمات کا بلا واسطہ اور بلا استثناء انطباق کیا جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کی تعلیمات کی اس ہمہ گیریت پر سلف و خلف میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اُمت کا اس بات پر ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے کہ دین کے احکامات جہاں عام افراد کے عقائد' اخلاق' عبادات اور اعمال سے بحث کرتے ہیں' وہیں دین کے احکام' امورِ سیاست اور نظامِ حکومت سے بھی متعلق ہیں' جن کی بجا آوری بھی اُسی طرح فرض اور ضروری ہے جس طرح دیگر اوامر و نواہی کی بجا آوری فرض ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرضیت اصلاً حکامِ سلطنت اور کار پردازانِ ریاست پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو نافذ کریں' اس کے مطابق فیصلے کریں' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں اور جہاد فی سبیل اللہ کا عَلم سربلند رکھیں۔ جب کہ عوام الناس کا فرض یہ ہے کہ وہ انفرادی احکام کی طرح امورِ سلطنت سے متعلق احکامات پر بھی حتی الوسع عمل کریں' اولوالامر کی اطاعت کریں' نیز شرعی تقاضوں اور تحدیدات کے مطابق اسلامی نظامِ حکومت و ریاست کی بقا کی کوشش کرتے رہیں' اور اگر دین کا نظام قائم نہ ہو تو اسے قائم کرنے کی بھرپور کوشش کر کے اپنے ایمان اور اللہ سے وفاداری کے دینی تقاضے کو پورا کریں۔

متذکرہ بالا تصورات کے بارے میں' جیسا کہ عرض کیا گیا' اُمت کے معتدل دھارے میں کبھی دو رائیں نہیں رہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وحدتِ دین و سیاست پر نہ تو عملی طور پر کوئی کوتاہی پیدا ہوئی اور نہ ہی فکری و ذہنی انتشار پیدا ہوئے۔ البتہ بعد کے ادوار کا عملی نقشہ بدلتا رہا... سیاست رفتہ رفتہ عملی طور پر دیانت سے جدا ہونا شروع ہوئی... اور اصحابِ سیاست اور رجالِ دین کے دائرہ کار اور دائرہ عمل مختلف ہوتے چلے گئے۔ اس دوئی کے اسباب کیا تھے اور یہ تقسیم کن کن مراحل سے ہو کر اپنے منطقی انجام تک پہنچی' یہ مختصر تحریر اس طویل بحث کی متحمل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ زیرِ بحث تحریر کا اصل مدعا ہے۔ البتہ اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک اُمت اپنے سیاسی زوال کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد استعماری طاقتوں کے براہ راست تسلط کا دور تھا جس میں مسلمان معاشروں کی بالفعل حیثیت کفار و مشرکین کی colonies کی بن گئی۔ استعماری قانون سربلند ہوا... اور معاشی وسائل مختلف ہتھکنڈوں سے استعماری طاقتوں کے کنٹرول میں آتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر استعماری قوتوں نے براہِ راست غلبہ کے بجائے بالواسطہ کنٹرول کی پالیسی کو اختیار کیا اور امورِ سیاست کو کہیں ''جمہوری قبا'' پہنا کر اور کہیں آمریت کا سبق پڑھا کر... اور امورِ معیشت کو ''سودی نظامِ بنکاری'' میں جکڑ کر ایک ایسا منظر نامہ پیدا کر دیا کہ بظاہر مسلمانوں کو ''آزادی'' کی لذت حاصل رہے... لیکن حقیقتاً وہ ان کے ذہنی وفکری اور معاشی غلام ہی بنے رہیں۔ آج اُمتِ مسلمہ کا منظر نامہ اسی کیفیت کا غماز ہے!

موجودہ حالات کے تناظر میں یہ سوال ضرور سر اُٹھاتا ہے کہ دین و سیاست میں اس قدر علمی وفکری ہم آہنگی و یکسوئی کے باوصف اور کثیر مذہبی سیاسی ہماہمی کے باوجود آج ان دونوں میں اتنا عملی بُعد کیوں ہے۔ آج یہ کیفیت کیوں ہے کہ بیشتر مسلمان ملکوں میں کفار و مشرکین کا چھوڑا ہوا نظام اور انہی کے پروردہ حکمران مسلط ہیں۔ کبھی ایک سیکولر گروہ مسندِ اقتدار پر براجمان ہو جاتا ہے تو کبھی دوسرا۔ حتیٰ کہ دینی مزاج کے جو اصحاب اور دینی جماعتیں الیکشن کے ذریعے حصولِ اقتدار کے لیے مصروفِ عمل ہیں وہ بھی جمہوریت کو پورا ''مذہبی تقدس'' دیتے ہوئے اسے برقرار رکھنے کا عزم رکھتے ہیں'... اس راستے سے ''دینی سیاست'' کرنے کا زعم بھی رکھتے ہیں... اور بدقسمتی سے اس جدوجہد میں جاہ و مال کی فتنہ سامانیوں سے مقاومت میں ان کی سیاست اور عام سیکولر سیاست میں نمایاں فرق بھی نظر نہیں آتا۔

ہم اس سلسلے میں نصح و خیر خواہی کے جذبے سے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ بعض اُن امور کی طرف اصحابِ فکر و نظر کی توجہ مبذول کروائیں جو یا تو غلط فہمی کی بنا پر اس وقت توجہ میں نہیں ہیں' یا محض shift of emphasis کی وجہ سے رجالِ دین اور دینی جماعتوں کو اُلجھن (illusion) سے دوچار کیے ہوئے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ جو ہماری دانست میں دینی سیاست کے ضمن میں اہم ہے وہ ''جمہوریت'' سے غیر متزلزل وابستگی کا معاملہ ہے۔ پاکستان کو قائم ہوئے ۶۳ سال گزر چکے ہیں اور یہاں اقتدار کی جنگ میں جمہوریت کی لولی لنگڑی ''نیلم پری'' کے رقص کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ تاہم حقیقی کیفیت یہی ہے کہ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ... تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اندریں حالات اب یہ بات سمجھنا قطعاً مشکل نہیں کہ جمہوریت اپنی اصلی شکل میں اللہ سے بغاوت اور کفر و الحاد سے عبارت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد ہی میں یہ نظریہ کارفرما ہے کہ حاکمیت خدا کی نہیں' جمہور کی ہے...' لہٰذا قانون سازی کا حق خدا اور اس کے رسول کو نہیں... جمہور عوام کو حاصل ہے...' اور اس ضمن میں ''اکثریتی رائے'' کو بالادست مانا جائے گا' چاہے اکثریتی رائے اللہ کی راہ سے گمراہ کرنے ہی کا ذریعہ کیوں نہ ہو:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الانعام:۱۱۶)

یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنے کی جملہ کوششوں کا حاصل ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے کہ

جمہوریت کے بعض ایسے مثبت پہلو جن سے اسلامی نظامِ سیاست میں جزوی طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے' مثلاً مشاورت عامہ یا خلیفہ کے چناؤ میں رائے شماری وغیرہ..... 'انہیں صرف اسی صورت میں بروئے کار لانا ممکن ہے جبکہ اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی غیر مشروط بالادستی پر کسی قسم کا اختلاف نہ ہو......اور یہ بات ''حاکمیتِ عوام'' کے بنیادی جمہوریتی تصور سے براہِ راست متصادم ہے۔ لہٰذا علمی طور پر جتنا زور جمہوریت کو مسلمان کرنے پر دیا گیا ہے عملاً جمہوریت اتنی ہی بے دین بنتی چلی گئی ہے...' اور اب تو دینی سیاسی جماعتوں نے واضح طور پر سیاسی جدوجہد کو ''مفادات'' کے حصول اور مسجد و مدرسہ کے ''بقا'' کی کوشش قرار دینا بھی شروع کر دیا ہے ...گویا امورِ سلطنت میں احکامِ شریعت کی بالادستی سے نظری طور پر بھی پسپائی اختیار کر لی گئی ہے۔ ہماری نگاہ میں یہ مغربی فکر و فلسفہ کی بہت بڑی فتح ہے کہ اس نے دین کے علمبرداروں کے ہاتھ میں جمہوریت کا پرچم تھما کر اللہ کی حاکمیت کے دعوے سے انہیں ''فارغ'' کر دیا ہے۔

معاملے کی سنگینی کے پیشِ نظر علماء' رجالِ دین اور دینی سیاسی جماعتوں کو اب اپنا قبلہ درست کرنا ہی ہوگا۔ انہیں ضرور جائزہ لینا ہوگا کہ جس جمہوری سیاست میں وہ خود آ پھنسے ہیں... یا...انہیں حالات نے لا پھنسایا ہے اس کے بارے میں دین کا مطالبہ ان سے دراصل کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دینی سیاست کے لبادے میں مفادات کی جو سیاست چل رہی ہے' اس کے نتیجے کے طور پر بجائے اپنی دینی ذمہ داری پوری کرنے کے...' وہ بے دین سیاست کی تقویت کا ذریعہ بن کر اللہ کی ناراضگی کا باعث بن رہے ہوں؟ نعوذ باللہ من ذٰلک! اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے...' آمین۔

دین و سیاست کے ضمن میں دوسرا اہم معاملہ ان کے باہمی تعلق اور نسبت و تناسب کا ہے...یعنی اس بات کا لحاظ اور وضاحت کہ اِن دونوں میں ''مقصود'' اور ''وسیلہ'' ہونے کا باہمی تعلق اور باہمی نسبت و تناسب کیا ہے۔ اس ضمن میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ عوام و خواص... ہر دو طبقے میں لوگ بالعموم افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بسا اوقات سیاسی جدوجہد کے شوق و جذبہ میں یہ بات ملحوظ نہیں رہ پاتی کہ سیاسی جدوجہد اور سیاسی غلبہ فی نفسہٖ ''مقصود'' ہے یا کسی مقصودِ حقیقی کے ضمن میں ''وسیلہ'' ہے۔

اسی معاملے کی دوسری انتہا یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض دفعہ انفرادی تقویٰ اور للّٰہیت کے زور میں... سیاسی غلبہ کے ضمن میں عائد فرائض کو ''دنیا داری'' قرار دے کر...اور امورِ سلطنت سے متعلق احکامِ شریعت کو کارپردازانِ سیاست کے حوالے کر کے... اور مسجد و مدرسہ اور خانقاہ میں مقید ہو کر تعلیم و تعلّم کی ذمہ داری ادا کر کے خود کو بریٔ الذمہ سمجھ لیا جاتا ہے اور امورِ سیاست کے ضمن میں دین کی جانب سے جو فرائض خاص طور پر اہلِ علم پر عائد ہوتے ہیں' انہیں یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔

متذکرہ بالا افراط و تفریط کے ضمن میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور علماء و فقہاء کی پیش کردہ تصریحات کے مطابق ہر کلمہ گو کے لیے' چاہے وہ عام انسان ہو یا سربراہ مملکت' زندگی میں مقصودِ اصلی رضائے الٰہی ہی ہونا چاہیے۔ اسے اگر حکومت کرنی ہے' اقامتِ دین کی جدوجہد کرنی ہے یا ایک عام شہری کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت سے زندگی گزارنی ہے...' ہر حال میں اس کا مقصدِ حیات اللہ کی رضا اور آخرت میں فلاح کا حصول ہی ہونا چاہیے۔ گویا سیاست وحکومت بجائے خود مقصود نہیں ہے' بلکہ یہ اصل مقصود کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اس انتباہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دینی سیاسی حلقے سیاست کے اس خارزار میں نفس اور شیطان کے پھیلائے ہوئے جال میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ وہ اصل مقصود اور وسیلہ کے مابین فرق وامتیاز بھلا بیٹھتے ہیں۔ وسیلہ مقصود بن جاتا ہے اور مقصود نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ کام جو سیاست وحکومت کی سطح کا ہو...' وہی اصل اور اعلیٰ کام قرار پاتا ہے۔ جب کہ دین پر عمل اور استقامت کے دوسرے جملہ اسالیب کمتر وہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔

متذکرہ بالا تقریر کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سیاست وحکومت کسی بھی درجہ میں مطلوب اور مقصود نہیں ہیں۔ بلاشبہ دین کی سیاسی سربلندی اور اس کی منظم جدوجہد اپنی جگہ بڑے اہم مقاصد ہیں ...جن پر بہت سے امورِ دینیہ کا مدار ہے۔ شریعت کی غیر مشروط بالادستی کے بغیر اجتماعیاتِ انسانی کے بیشتر شعبوں کو دینی تعلیمات و احکامات کے تحت لانا ممکن نہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ نفاذِ شریعت کے بغیر ایک فرد کے لیے ذاتی عبادت اور ذاتی تقویٰ وللّٰہیت کے تقاضے پورے کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہمارا کہنا تو صرف یہ ہے کہ ایسی سیاست اور سیاسی جدّوجُہد جس میں اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح پیشِ نظر نہ رہے... بلکہ محض جاہ وسلطنت' مفادات اور ''جمہوریت'' کے مقاصد پیشِ نظر ہوں' ہرگز فائدے کا سودا نہیں۔

ع ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

آخری بات یہ ہے کہ دین کی اس غریب الوطنی کے دور میں' جبکہ صرف سیاست وحکومت ہی کے ضمن میں نہیں' عقائد' اخلاق' اطاعت' جہاد' غرضیکہ ہر پہلو سے دورِ زوال اپنی انتہاؤں کو پہنچا ہوا ہے' اور کیفیت بقول مولانا حالی یہ ہے کہ ؎

وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

احیائے دین اور غلبۂ دین کی آج سب سے بڑی ذمہ داری طبقہ علماء اور رجالِ دین پر عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ حضرات ''حزب اللہ'' بن کر... اور تمام مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے بلند ہو کر... خالصۃً رضائے الٰہی کے جذبے سے دین کے احیاء اور غلبہ کی جدوجہد کے لیے میدانِ عمل میں نہ اترے... تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ''اُمتِ مرحوم'' کا جزو بننے اور ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ'' کا حقدار کہلانے کی ''نوید''... اِن ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے کی کسی ''وعید'' کے سامنے بے وقعت نہ ہو جائے' کہ... ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی دینی ذمہ داریاں پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین۔